

# اخلاق

## نبوت سے اکتسابِ فیض

### کی شرط اور علامت

پروفیسر حافظ احمد یار

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم  
اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ..... بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ (الاعراف)

سیرت نگارانِ رسول ﷺ میں سے ایک سے زیادہ نے اس سوال پر اپنے اپنے رنگ میں بحث کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغام کی رسالت اور اپنے آخری نبیؐ کی بعثت کے لیے اہل عرب کو ہی کیوں منتخب فرمایا؟

مشہور مصری مؤلف لطفی جمعہ نے اپنی کتاب ”نورۃ الاسلام وبطل الانبیاء“ کا آغاز ہی اس طرح کیا ہے:

”دنیا کی تاریخ، انسانی تمدن کی داستان اور قدیم و جدید تہذیبوں کی کہانی میں کتنے ہی قابلِ توجیہہ واقعات اور پہیلی یا معمہ سے بھی زیادہ حیران کن چیزیں سامنے آتی ہیں جنہیں پڑھ کر یا سن کر آدمی محو حیرت رہ جاتا ہے۔ اور اسی قسم کے ناقابلِ فہم معموں میں سے یہ چستان بھی ہے کہ آخر اللہ نے انوارِ نبوت و رسالت کی تجلی گاہ بنانے کے لیے جزیرۃ العرب کو ہی کیوں منتخب کیا؟“ (لطفی، ص ۷)

اور کچھ آگے چل کر اہل عرب کا عموماً اور قریش کا خصوصاً حوالہ دیتے ہوئے یہی سوال دہرایا ہے:

”آخر اللہ تعالیٰ نے باقی ساری مخلوقات کو چھوڑ کر ان لوگوں ہی کو کیوں اس دین کا سرچشمہ اور اس کا

مرکز وضع بنانے کے لیے چن لیا؟ (الطی، ص ۳۸)

اسی طرح سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبیؐ کی جلد چہارم میں ”عربوں کی خصوصیات اور خیر الامم بننے کی صلاحیت“ کے عنوان سے ایک باب میں اس سوال کے جواب سے بحث کی ہے۔ اس موضوع پر تازہ ترین اور بہترین بحث مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب ”نبی رحمت ﷺ“ میں کی گئی ہے جس کے ایک باب کا عنوان ہے: ”محمد رسول اللہ ﷺ جزیرۃ العرب میں کیوں مبعوث ہوئے؟“ — اس قسم کے سیرت نگاروں نے اپنی اپنی دانش کے مطابق اس انتخاب ربانی کے لیے اہل عرب کے دنیا کی دوسری قوموں سے زیادہ اہل اور مستحق ٹھہرنے کے مختلف اسباب یا نکات گنوائے ہیں۔ مگر ان سب میں مشترک چیز اہل عرب کی بعض خاص خاص اخلاقی خوبیوں کا ذکر ہے جس نے ان لوگوں کی فطرت سلیمہ کو منجھنے سے بڑی حد تک محفوظ رکھا۔

آخر اللہ تعالیٰ نے اُس وقت کی تمام مہذب اور متمدن قوموں کو چھوڑ کر عرب کے ان گن گنا مہذبوں کو اس منصبِ عظیم کے لیے کیوں چن لیا؟ اگر یہی نبی ہندوؤں، بدھوں، یہودیوں یا چینیوں، ایرانیوں اور رومیوں میں سے کسی ایک قوم میں مبعوث کر دیے جاتے تو کیا وہی نتائج حاصل نہ ہوتے اور کیا ہی انقلاب برپا نہ ہو جاتا جو اہل عرب کے ذریعے سے ہوا؟ جو وقت کی ”بڑی طاقتیں“ (super powers) تھیں، کیا ان میں سے کوئی بھی ”بہترین“ اُمت بننے کے فرائض سرانجام نہیں دے سکتی تھی؟ — بظاہر یہ سوالات لغو نظر آتے ہیں، اس لیے کہ مصاحح کلیۃً الہیہ کا احاطہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے اور اسی لیے قرآن کریم نے اس مسئلہ پر یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ:

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾ (الانعام: ۱۲۴)

”اور اللہ سب سے بہتر جانتا ہے کہ اس کا پیغام کہاں اور کس کے حوالے کیا جائے!“

تاہم اس اندازِ فکر سے غالباً ایک اور سوال کا جواب سامنے آ سکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں آج اللہ کی کتاب اور اس کے آخری نبیؐ سے انتساب اور اسلام کے نعرہ ہائے بے حد و حساب اور ان کے فیوض و برکات سے اکتساب کی علامات کیوں نایاب ہوتی جا رہی ہیں؟ کیا ہم کہیں عہدِ جاہلیت کے یہود و ہنود یا روم و عجم کی طرح بعض ایسی بنیادی اقدار سے تو منحرف نہیں ہو گئے جن کو نبوت سے اکتسابِ فیض کی شرط قرار دیا جاسکتا ہے؟

آنحضرت ﷺ نے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں اہل عرب کی جس طرح کا یا پلٹ دی وہ عجائبات تاریخ کا سب سے بڑا عجوبہ ہے۔ عربوں کی اس قلبِ ماہیت اور تاریخِ عالم کے اس سب سے حیرت انگیز انقلاب کی اہمیت اور عظمت اور اس کے نتائج کی ہمہ گیری اور وسعت کو سمجھنے کے لیے سیرت نگار ظہورِ اسلام کے وقت دنیا بھر کی عموماً اہل عرب کی خصوصاً دینی، معاشی، سماجی اور اخلاقی حالت بلکہ ان سب حالتوں

کی ابتری کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ہمارے موضوع کا تعلق اخلاقی حالت سے ہے۔

تجلی یعنی غیر عرب اقوام کی ناگفتہ بہ اخلاقی حالت کا بیان یوں تو کم و بیش سیرت یا تاریخ کی ہر ایک کتاب میں مل جاتا ہے لیکن ان تمام اخلاقی خرابیوں کی اصل وجہ کا تجزیہ جس طرح شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ”حجتہ اللہ البالغہ“ میں کیا ہے، کسی اور کتاب میں اس کی مثال کم ملتی ہے۔ اگرچہ حضرت شاہ صاحب نے اپنے زمانے کی اصطلاحات اور اُس دور کے رسم و رواج کی زبان میں بات کی ہے مگر معنایہ بڑی حد تک آج ہم پر منطبق ہوتی نظر آتی ہے، بلکہ اس میں ہماری اخلاقی بیماری کی صحیح تشخیص نظر آتی ہے۔ حضرت دہلویؒ کا یہ بیان اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ان کے بعد آنے والے مؤلفین کو اس موضوع (چھٹی صدی مسیحی میں اقوام و مذاہب عالم کی حالت) پر لکھتے ہوئے جدید یورپی مطبوعات و تالیفات سے استفادہ اور دائرہ ہائے معارف کے ذریعے اپنی معلومات میں اضافہ کا موقع ملا جن کا شاہ صاحب کے زمانے میں کہیں وجود تک نہ تھا۔ اس لحاظ سے ان کا یہ بیان تاریخ اور فطرت انسانی کے بارے میں ان کے علم لدنی کا مظہر معلوم ہوتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی اس ساری تحلیل و تفصیل سے جو بات کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قیّش پسندی، تن آسانی اور دنیوی لذائذ و مفاخر کی خاطر تمام اخلاقی قدروں کو پامال کرنے والے لوگوں کے لیے بحیثیت ایک قوم یا ملت کے (کیونکہ غیر معمولی افراد کی قلیل تعداد تو ہر جگہ ممکن ہے) نبوت سے اکتساب فیض کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں، خصوصاً اس درجے کا اکتساب جس سے خیرالام بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے ہرگز ممکن نہیں ہوتا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ مشیتِ الہی نے ان اقوام کو اس منصبِ عظیم کا اہل نہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

اب دوسری طرف اگر اہل عرب یعنی ان لوگوں کے قبل از اسلام رذائل و فضائل پر ایک نظر ڈالیں جو فیضانِ نبوت کی بدولت بہترین اُمت بن گئے، تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی دینی حالت تو ناگفتہ بہ تھی ہی، ان کی اخلاقی حالت بھی سخت دگرگوں تھی۔ اور سیرت نگاروں نے بجا طور پر ”شبِ ظلمت“، ”عرب کا تاریک دور“ اور ”فسادِ بروج“ وغیرہ عنوانات کے تحت اس کی کیفیت بیان کی ہے۔

یہ لوگ بغض و انتقام، سنگدلی و سفاکی، چوری اور ہرنی، قتل و غارت، بے حیائی و بدتمیزی، زنا و فواحش، نسبی تعصب و غرور، قمار بازی، شراب نوشی اور دختر کشی و سود خوری میں قریب قریب ضرب المثل تھے۔ ان سب معائب کی تفصیل سے ادب و تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں، لیکن سب معائب اور ساری خرابیوں کے باوجود مختلف عوامل نے ان کے اندر بنیادی اور اصولی اخلاق کے احساس کو بالکل مردہ نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ محاسن اخلاق سے یکسر معزئی نہ تھے بلکہ اخلاقی تعلیمات کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے نظامِ اخلاق کے بدترین اجزاء میں بھی اخلاقی حسن کی ایک جھلک موجود تھی۔ شراب نوشی اور قمار بازی

فیاضی اور سخاوت کا مظہر تھی۔ دختر کشی کا رواج غیرت کا نتیجہ تھا۔ قبائلی عصبیت دراصل قومی حمیت کی ہی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ غیرت، پابندی، عہد، شجاعت، فیاضی اور صلہ رحمی ان کے معروف اخلاق تھے۔ اسی طرح وہ معروف (بھلائی) امانت، راست گوئی اور پاک دامنی کو کرم الخلق اور خصال الخیر میں شمار کرتے تھے اور جس آدمی میں یہ صفات پائی جاتی تھیں اسے تو قیروں و مکرم کا مستحق سمجھتے تھے۔

۳۔ یہ درست ہے کہ ان کے ہاں اخلاقِ حسنہ کی بنیاد زیادہ تر شہرت طلبی، حُبِ جاہ اور ناموری پر تھی۔ تاہم ان کے اخلاق و اعمال میں ایسے عناصر و اجزاء بھی شامل تھے جنہیں اسلام نے بھی محاسن و مکارم شمار کیا۔ مشہور حدیث ((خِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقَّهُوا))<sup>(۱)</sup> میں اس ”تحویل قبلہ“ اخلاق کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ دوسری جگہ خود حدیث میں ہی خیارِ کُرم کی تفسیر ((إِنَّ خِيَارَكُمْ أَحَاسِنُكُمْ أَخْلَاقًا))<sup>(۲)</sup> سے کی گئی ہے۔

دورِ جاہلیت کے جن واقعات و حوادث میں اہل عرب خصوصاً اہل مکہ کے اخلاقی محاسن کی ایک واضح جھلک نظر آتی ہے اس کی ایک مثال تاریخ نے ”حلف الفضول“ کی صورت میں محفوظ رکھی ہے۔ عبداللہ بن جدعان کے مکان پر منعقد ہونے والے اسی حلف میں (جس کی وجہ تسمیہ جو بھی ہو) شامل ہونے والے قریش کے بعض خانوادوں کے نمائندوں نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ مکہ میں ظلم و بے انصافی کے واقعات کو محض غیر جانبدار مبصر یا خاموش تماشا کی حیثیت سے نہیں دیکھیں گے، ایک مظلوم کی عملی اور ٹھوس مدد کیا کریں گے۔ یہ حلف جسے سیرت نگار ”اکرم حلف و اشرفہ سمع بہ فی العرب“ (عربوں کی تاریخ کا سب سے شریفانہ اور بہترین معاہدہ) قرار دیتے ہیں، ابن ہشام کے مطابق اس کے اغراض و مقاصد یوں تھے:

”انہوں نے عہد و پیمان باندھا کہ مکہ میں مقامی یا غیر مقامی جس آدمی پر بھی وہ کوئی ظلم ہوتے دیکھیں گے تو وہ سب مل کر مظلوم کی مدد کریں گے اور ظالم کو مجبور کر دیں گے کہ وہ مظلوم پر کیے گئے ظلم کی پوری پوری تلافی کرے۔“ (سیرت ابن ہشام)

کہا جاسکتا ہے بلکہ کہا گیا ہے کہ اس معاہدے کا دائرہ نفاذ بہت محدود تھا۔ اس کا مقصد صرف حرمِ مکہ میں مظالم کی روک تھام تھا اور اس کا فائدہ بھی بالآخر اہل مکہ ہی کو تھا تا کہ حرم کی عزت و حرمت لوگوں کے دلوں سے کم نہ ہونے پائے۔ لیکن کیا اپنے وطن عزیز کے کسی ایک شہر بلکہ کسی گاؤں میں بھی اس طرح کا کوئی ادارہ یا تنظیم قائم ہے؟ چلیے اپنے وطن یا شہر کی ساکھ کی خاطر ہی سہی — حالانکہ ایسا کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے۔ پھر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس معاہدے کے شرکاء نے اپنی بات کو صدق دلی اور بے لاگ منصفانہ قوت کے ساتھ نافذ بھی کیا تھا (تفصیل کے لیے دیکھئے: ابن کثیر، جلد اول، ص ۶۱-۲۵۹)

(۱) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ام کنتم شهداء اذ حضر یعقوب الموت .....

(۲) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب حسن الخلق والسخاء وما یکرہ من البخل۔

آج یو این او اور سلامتی کونسل تک میں مہذب ترین لوگ انصاف اور حق کو کس طرح اپنی سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دیتے ہیں اسے سامنے رکھیں تو حلف الفضول منعقد کرنے والوں کی اخلاقی قوت ان کی فطرتِ سلیمہ کا وزن اور ان کے اندر خیر الامم کے ہر اول دستوں میں شمولیت کے شرف کی اخلاقی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔

آقائے دو جہاں ﷺ خود بھی (بہر بیس سال) عربوں کے اس سب سے شریفانہ معاہدے میں شامل ہوئے تھے۔ آپ اس معاہدے سے بہت خوش تھے اور بعثت کے بعد بھی آپ نے اس کی تعریف و تحسین کی۔

الغرض اگرچہ اہل عرب کی خوبیاں بھی جاہلی رذائل کے خس و خاشاک میں دب کر رہ گئی تھیں، تاہم یہ ثابت ہے کہ ان میں بعض نہایت اچھے اخلاقی اوصاف موجود تھے۔ کم از کم حفاظتِ حق اور اعانتِ مظلوم کی حد تک تو آج کی تمدن ترین اقوام بھی ابھی تک عرب جاہلیت سے کچھ نیچے ہی کے درجے پر ہیں۔

اہل عرب کی مثال ایک ایسی زرخیز زمین کی تھی جو کاشت و نگہداشت نہ ہونے کے باعث خود رو خاردار جھاڑیوں کا جنگل بن گئی تھی۔ ان میں خیر کے سوتے اٹ ضرور گئے تھے مگر بالکل خشک نہیں ہوئے تھے۔ وہ ایک ایسا بیج تھے جو قوتِ نمو سے محروم نہیں ہوا تھا۔ ہادی برحق نے اس قوم کے ان اخلاقی محاسن کو ترتیب دے کر مکارمِ اخلاق کی بلند یوں تک پہنچا دیا۔ واقعی وہ ایک طرح سے اس کے اہل اور حق دار ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ﴿وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا﴾ (الفتح: ۲۶)

ہمارے اس موقف کہ نبوت سے اکتسابِ فیض کے لیے اخلاقی خوبیاں ایک شرط کی حیثیت رکھتی ہیں کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سب سے پہلے مسلمان ہونے والے لوگ اخلاقی محاسن کے مداح بھی تھے اور ان سے متصف بھی۔

سب سے پہلے ام المؤمنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ دیکھئے۔ وہ زمانہ جاہلیت میں اپنی پاک بازی کے باعث ”طاہرہ“ کے لقب سے مشہور تھیں۔ چنانچہ ابن ہشام لکھتے ہیں:

”وہ زمانہ جاہلیت میں اپنی پاکیزگی اور پاک دامنی کے باعث طاہرہ کہہ کر پکاری جاتی تھیں۔“  
حضرت خدیجہؓ نے نکاح سے قبل ایک عورت کے ذریعے آنحضرت ﷺ کا عندیہ معلوم کرنے کے بعد آپ کو گھر میں بلوایا اور مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنا رشتہ خود پیش کیا:

”اے میرے چچا زاد! میرے اندر آپ کی طرف میلان کئی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ازاں جملہ یہ کہ آپ سے میری (برادری کی) رشتہ داری بھی ہے۔ آپ اپنی قوم میں صاحبِ عزت بھی ہیں۔ ان سب پر مستزاد آپ کی امانت، اخلاص اور راست گفتاری ہے۔“

پہلی وحی کے نزول اور بعثت کے ابتدائی ایام میں جو واقعات و حالات پیش آئے تھے ان کی بنا پر

حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت ﷺ کو ان الفاظ میں تسلی دی تھی:

”ہرگز نہیں! بخدا اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپ رشتہ داری کا پاس لحاظ کرتے ہیں دوسروں کا بوجھ بھکا کرتے ہیں، محتاجوں کے کام آتے ہیں، مہمان نواز ہیں اور راہِ حق کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں مدد کرتے ہیں۔“

مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے بارے میں سیرت نگار لکھتے ہیں کہ آپ ایک بااخلاق اور نیک دل تاجر تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قبل اسلام اخلاقی محاسن کی ایک گواہی ابن الدغنے کے بیان سے ملتی ہے۔ یہ واقعہ یوں ہے کہ قریش کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر ابوبکر صدیق بھی آنحضرت ﷺ سے اجازت لے کر غالباً حبشہ کی طرف ہجرت کے لیے روانہ ہوئے۔ مکہ مکرمہ سے دو ایک دن کے فاصلے پر انہیں ابن الدغنے ملا (اصل نام سبیعہ بن رفیع تھا اور وہ اس وقت امایش کا سردار تھا جو ایک مجموعہ قبائل تھا)۔ اس نے پوچھا: تم کہاں چلے؟ جب انہوں نے بتایا کہ میری قوم نے مجھے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے اور انہوں نے مجھے بہت ہی اذیت پہنچائی ہے اور سخت مصیبت میں ڈال دیا ہے تو ابن الدغنے نے کہا:

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بخدا آپ تو قبیلہ کے مایہ ناز فرزند ہیں۔ آپ مصیبت زدگان کی مدد کرتے ہیں، نیکی اور بھلائی کے کاموں میں حصہ لیتے اور محتاجوں کے کام آتے ہیں۔ واپس چلیے، میں آپ کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔“

ہم ان مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں، ورنہ تمام ”سابقین اولین“ صحابہ رضی اللہ عنہم میں قبل از اسلام ہی کسی نہ کسی خالص اخلاقی خوبی کے وجود پر دلالت کرنے والے واقعات مل سکتے ہیں۔

اور شاید اہل عرب کی محاسن شناسی اور محاسن پذیری کی اس صلاحیت اور اعمال و اخلاق میں حسن و جمال کی ستائش کی اہلیت کی بنا پر ہی ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاکؐ کے محاسن و فضائل کے جمال بے مثال میں سے آپؐ کے ہم وطنوں کو سب سے پہلے آپؐ کے ”خلقِ عظیم“ ہی کی وہ جھلک دکھائی جس نے ان کے دل موہ لیے تھے۔ آنحضرت ﷺ کا قبل از بعثت ہی اپنے نام کے بجائے الصادق اور الامین کے لقب سے پکارا جانا تو سیرت کے مبتدی طالب علم کو بھی معلوم ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ کے صاحبِ خلقِ عظیم ہونے کا تعلق آپؐ کی قبل از بعثت زندگی سے ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ اخلاقیاتِ نبویؐ کے کسی بھی بیان میں آیت کریمہ ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (آپؐ کی اخلاقی عظمت تو یقیناً ایک مسلمہ امر ہے) کو کورس کے بند کی حیثیت حاصل ہے۔ اس آیت سے اور اس کی تفسیر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی مشہور حدیث ”كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ“ (۱)

(۱) مسند احمد، ح ۲۳۴۶۰۔

(آپ کا اخلاق تو قرآن تھا) سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ کے اخلاق کی تشکیل اور مکارم کی تکمیل قرآن کریم کے ذریعے اور اس کے مطابق ہوئی۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ ﴿وَأَنَّكَ لَـٰعَلَىٰ خُلُقِي عَظِيمٌ﴾ سورة القلم کی چوتھی آیت ہے اور اس بات پر قریباً سب اہل علم کا اتفاق ہے کہ سورة القلم بلحاظ نزول قرآن کریم کی دوسری یعنی بالکل ابتدائی دور کی مکی سورت ہے، اور یہ آیت مبارکہ آنحضرت ﷺ کی نبوت کی صداقت پر سب سے پہلی عقلی دلیل ہے جو قرآن پاک نے پیش کی۔ (اس مضمون کی دوسری آیات جو سورة یونس اور سورة العنکبوت میں آئی ہیں وہ بھی مکی دور کی ہیں مگر بعد کی ہیں) قرآن حکیم کا آپ ﷺ کے خلق عظیم کو بطور دلیل پیش کرنے سے مدیہ پہلو کے علاوہ چند مزید امور سامنے آتے ہیں ازاں جملہ:

(۱) اہل مکہ (جو جاہلیت عرب کے رذائل و فضائل کے نمائندہ قرار دیے جاسکتے ہیں) میں عموماً اتنی اخلاقی حس ضرورت تھی کہ وہ اخلاقی عظمت پر مبنی اس استدلال سے قائل کیے جاسکتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ آنحضور ﷺ کے اخلاقی عالیہ کی طرف یہ تبلیغ اشارہ کرنے کے بعد اسی سورت کی اگلی آیات (۱۳ تا ۱۰) میں یہ بیان ہوا ہے کہ جو آدمی مجموعہ رذائل ہو چاہے وہ کتنا ہی صاحب جاہ و مال ہو اسے بیچ سمجھو۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَطْعُ كُلَّ حَلَّافٍ مِّمَّهِنَ ۖ هَمَّازٌ مِّشَاءٌ ۚ بَنِمِيمٌ ۝ مَنَاعٍ لِلْخَبِيرِ مُعْتَدٍ ۚ أَنِيمٌ ۝﴾

عَنْلٍ ۚ بَعْدَ ذَلِكَ رَنِيمٌ ۝ ۱۳ ۚ أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ۝﴾

”ہرگز نہ دو اس شخص سے جو تمہیں کھانے والا پست فطرت، طعن جو چغل خور، مانع خیر، دھاندلی باز، بدل جفا کار اور ساتھ ہی بد اصل بھی ہے، محض اسی بنا پر (چودھری بنا پھرتا ہے) کہ بہت مال و اولاد رکھتا ہے۔“

معلوم ہوتا ہے کہ مخاطبین ”خلق عظیم“ اور ان آیات میں بیان کردہ ”رذائل رسد“ کے تغایر و تجانس کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

نابا یہ کہ — اس آیت ﴿وَأَنَّكَ لَـٰعَلَىٰ خُلُقِي عَظِيمٌ﴾ کے مضمون اور اس کے زمانہ نزول کو سامنے رکھنے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ قبل از بعثت ہی صاحب خلق عظیم تھے۔ محمد عزت دروزہ لکھتے ہیں:

”اور یہ خلق عظیم جس کی بنا پر آنحضور ﷺ اس ثنائے ربانی کے مستحق ٹھہرے اس سے آپ یقیناً قبل از بعثت آراستہ ہو چکے تھے بلکہ اسی چیز نے آپ کو اس برگزیدگی اور اس منصب عظیم کا اہل بنا دیا تھا“ اور یوں تو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے کہ اس کی رسالت کے لیے کون اور کتنا موزوں ہے۔“

یوں لگتا ہے کہ قرآن کریم نے آنحضور ﷺ کے خلق کی تشکیل یا تکمیل نہیں کی بلکہ اسے تدریجاً نمودار

کیا ہے۔ قرآن و سنت میں اخلاقیات پر جو کچھ بھی بیان ہوا ہے وہ صرف آنحضرت ﷺ کے خلقِ عظیم کے خدوخال کی مکمل تصویر کشی ہے اور اسی لیے آپ کی ذات گرامی کو اُمت کے لیے ”اُسوۂ حسنہ“ قرار دیا گیا۔ خود اُسوہ کے لفظ میں عمل اور کمال کی موجودگی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

ثالثاً یہ کہ — اتنی بات تو ہم سب کو معلوم ہے کہ نبوتِ محمدی (علیٰ صاحبہا السلام) کی صداقت پر جملہ عقلی و فطری دلائل کی تبلیغ و اشاعت مسلمانوں پر فرضِ کفایہ ہے۔ اس کے لیے عہدِ رسالت اور قرنِ اول کی طرح آج بھی دنیا کے سامنے صرف آنحضرت ﷺ کے صرف دو معجزوں کو پیش کرنا کافی ہے۔ ایک قرآن دوسرے اخلاقِ النبیؐ۔ ابتدائے اسلام میں جو بھی مسلمان ہوا وہ یا قرآن سن کر متاثر ہوا یا نبی اکرم ﷺ کا خلقِ عظیم دیکھ کر۔ اہل مکہ خلقِ محمدی کا مشاہدہ کر سکتے تھے — مابعد النبی ادوار میں دنیا کو اس کا مشاہدہ کرانے کی ذمہ داری اُمت پر ہے کہ ایک طرف اخلاقیاتِ نبوی سے متصف اور متخلق ہونا ہر مسلمان پر (حسب استطاعت) فرضِ عین ہے اور دوسری طرف اخلاقیاتِ نبوی کا مطالعہ اور اس کی تبلیغ و اشاعت سب مسلمانوں پر فرضِ کفایہ ہے۔

رابعاً یہ کہ — آج بھی اسلام کی تبلیغ ان ہی لوگوں میں اور ان ہی قوموں میں زیادہ مفید اور مؤثر ہوگی جن کی اخلاقی حس زندہ ہے۔ نیز یہ کہ اسلام کی اشاعت کے لیے اس کے غلبہ کا دورِ ثانی لانے کے لیے اور فیوض و برکاتِ نبوت کو پھیلانے کے لیے صرف اور صرف گرمیِ گفتار پر و پیگنڈا اور اشتہارِ بیا محض مذاکرے اور سیمینار نہیں بلکہ اس کے ساتھ سب کے مشاہدہ و تجربہ میں آنے والی زبردست اخلاقی قوت درکار ہوگی۔ اسلام جہاں بھی پہنچا ہے زیادہ تر صلحائے اُمت کے اخلاق و کردار کی بدولت پہنچا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ابتدا سے ہی صرف اخلاقی نظریاتی تعلیم نہیں بلکہ عملی اخلاق پر زور دیا۔ توحید رسالت، آخرت پر ایمان کی طرح محاسنِ اخلاق سے عملاً مزین ہونا مسلمان کی ایک لازمی خصوصیت یا بالفاظِ دیگر نبوت سے اکتسابِ فیض کی علامت قرار دیا۔ یوں تو قرآن کریم کی متعدد آیات اور عہدِ رسالت کے کثیر واقعات اور صحابہ کرامؓ کے کارنامہ ہائے حیات میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے مگر ابتدائی دور کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف دو واقعات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

(۱) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ پہلے پانچ یا سات مسلمانوں میں سے ہیں۔ انہوں نے جب آنحضرت ﷺ کے اعلانِ نبوت کے بارے میں سنا تو اپنے بھائی کو در یافتہ احوال کے لیے مکہ بھیجا۔ اس نے واپس جا کر آنحضرت ﷺ کے بارے میں بھائی کو یہ رپورٹ دی تھی:

”وہ بھلائی کا حکم دیتا، برائیوں سے منع کرتا اور مکارمِ اخلاق کا حکم دیتا ہے۔“

یہاں اخلاق کے ضمن میں ”تعلیم“ یا ”تلقین“ یا ”تبلیغ“ وغیرہ کی بجائے ”امر“ کا لفظ قابلِ غور ہے۔ اخلاق کا تعلق محض فکر و دانش سے نہیں، قوتِ عمل سے ہے۔ یہ کچھ پڑھنے کی مشق نہیں بلکہ کچھ کرنے کی

تربیت کا نام ہے۔

(۲) ہجرت حبشہ ۵ نبوی میں ہوئی۔ نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنے معروف خطبہ میں جس طرح جاہلیت کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ اسلام کا تعارف کرایا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاقی تربیت اور اصلاح عقائد کا کام ساتھ ساتھ اور ابتدا ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ نبوت سے اکتساب فیض کے بعد مسلمانوں کے عقائد و افکار کے ساتھ ان کے اعمال اور اخلاق میں کیا تبدیلی آ جاتی تھی۔ اس خطبہ کے جتنے جتنے فقرے قابل غور ہیں:

کہا: ”اے بادشاہ! ہم پروردہ جاہلیت قوم تھے۔ بتوں کو پوجتے، مُردار کھاتے اور بے حیائیوں میں مبتلا تھے۔ رشتہ داروں کا حق مارتے تھے اور ہمسایوں کو دکھ دیتے تھے اور ہم میں سے جو طاقتور ہوتا وہ کمزور کو چھڑک کھا جاتا۔ پھر اللہ نے ہم میں ایک رسول بھیجا جس کے خاندان، حسب نسب اور جس کی سچائی امانت اور پاک بازی سے ہم پہلے واقف تھے۔ انہوں نے ہم کو ایک اللہ پر ایمان لانے اور صرف اسی کی عبادت کرنے کی دعوت دی اور انہوں نے ہم کو سچ بولنے، امانت ادا کرنے، رشتہ داروں کے حقوق کا خیال رکھنے، پڑوسی سے حسن سلوک کرنے، ناجائز اور حرام باتوں اور خوریزی سے پرہیز کا حکم دیا۔ بے حیائی کے کاموں، جھوٹ بولنے اور یتیم کا مال کھانے سے منع فرمایا۔ پس ہم ان پر ایمان لائے اور ان کی پیروی کی۔ جو انہوں نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام مانا اور جو انہوں نے حلال بنایا اس کو حلال تسلیم کیا۔“ (سیرت ابن ہشام)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکارم اخلاق کی اہمیت یوں بھی واضح فرمائی کہ بعض دفعہ آپ زمانہ جاہلیت کے اصحاب مکارم و محاسن کی قدر دانی فرماتے اور ان کے اخلاقی کردار کو بنظر استحسان دیکھتے تھے۔ عبد اللہ بن جدعان (بانی جلف الفضول) کو آپ نے کتنی دفعہ تعریف بھرے الفاظ سے یاد فرمایا، حالانکہ ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ جس آدمی نے (ایمان لا کر) زندگی میں ایک دفعہ بھی اللہم اغفر لی خطیبتی یوم الدین نہ کہا ہو اس کی مغفرت کیسے ہو؟

اسی قسم کا ایک واقعہ حاتم طائی کی بیٹی کا ہے۔ وہ اسیر ہو کر جنگی قیدیوں کے ساتھ آئی تھی۔ اس نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی:

”حضور! میرا باپ ہلاک ہو گیا اور فدیہ گزار نہ رہا۔ اگر یہ مناسب جا میں تو مجھے رہا کر دیں اور قبائل عرب میں میری بے عزتی نہ ہونے دیں۔ میں اپنے قبیلے کے سردار کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ لوگوں کو مصیبت سے نکالتا تھا۔ وہ نیک شہرت کا مالک تھا۔ مہمان نوازی کرتا تھا اور بھوکوں تنگوں کی ضروریات پوری کرتا تھا اور اس نے کبھی کسی حاجت مند کو خالی نہیں جانے دیا۔ میں حاتم طائی کی بیٹی ہوں۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بچی! یہ باتیں (جو تو نے بیان کیں) یہی تو ٹھیک ٹھیک اہل ایمان کی صفات ہیں۔ اگر تیرا باپ مسلمان ہوتا تو ہم اس کے لیے دعائے رحمت بھی مانگتے۔“ پھر حکم دیا کہ اسے رہا کر دیا

جائے کیونکہ اس کا باپ مکارم اخلاق کو پسند کرتا تھا اور اللہ تعالیٰ بھی مکارم اخلاق کو پسند فرماتا ہے۔  
یہ سن کر ایک صحابی ابو بردہ بن نیار رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور سوال کیا: ”یا رسول اللہ ﷺ کیا مکارم اخلاق آپ کو (اس قدر) پسند ہیں؟“ تو آپ نے فرمایا: ”قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ کوئی ایک آدمی بھی جنت میں حسن عمل کے بغیر نہیں جائے گا۔“  
جب بھی ہم مکارم اخلاق اور اخلاقیات نبوی کی بات کرتے ہیں تو اس وقت ہمیشہ تعمیر کردار کا مثبت پہلو مراد ہوتا ہے۔ اس درجہ کے حصول کے لیے منفی پہلو یعنی رذائل سے اجتناب بھی ضروری ہے۔ سزا اور مذمت و ملامت سے بچنا ایک بات ہے مگر انعام اور مدح و ثنا کا حق دار ٹھہرنا عظیم تر بات ہے۔ قرآن کریم میں تعمیر اخلاق کے ان دو مراحل کو ہی ”اجتناب کبائر“ اور ”مسابقت علی الخیرات“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّ تَجْتَنَّبُوا کَثِیْرًا مِّنْهُنَّ عَنَّا نُكَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّئَاتِکُمْ وَنُدْخِلْکُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَٰکِنْ تَعْمَلُوْنَ اِلَّیَّ غَیْرَ بَصٰرٍ﴾ (النساء)

”جن باتوں سے تم کو منع کیا جاتا ہے اگر تم ان میں سے بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے تو ہم تمہارے چھوٹے موٹے قصور کو محو کر دیں گے اور تم کو مقام عزت پر جگہ دیں گے۔“  
﴿وَلٰکُلٍّ وَّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّیْهَا فَاَسْتَبِقُوا الْخَیْرَاتِ﴾ (البقرة: ۱۴۸)  
”اور ہر ایک (مقام) کا ایک مرکز توجہ (یا مطمح نظر) ہوتا ہے جس کی طرف وہ رخ کرتا ہے۔ سو تم نیک کاموں میں سبقت لے جانے کی تگ و دو کرو۔“

سیرت النبی ﷺ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اخلاق کی تربیت اور تکمیل کے لیے اس ترتیب اور تدریج کو ملحوظ رکھا۔ آپ نے سب سے پہلے ان اصولی اور بنیادی اخلاق پر زور دیا جو کم و بیش ہر معاشرے کے سلیم الفطرت افراد میں پائے جاتے ہیں۔ ایسے افراد میں اسلام کی طرف ایک فطری کشش اور نبوت سے اکتساب فیض کی ایک شرط یا اہلیت اور فطری استعداد موجود ہوتی ہے۔  
دوسرے درجے پر وہ لوگ آتے ہیں جن میں پہلے سے یہ شرط یا وصف اخلاق عملاً موجود نہ تھا۔ نبی ﷺ سے متعلق ایمان قائم ہو جانے یعنی اسلام کو قبول کرنے یا اسلام کا دعویٰ کرنے کے ساتھ ہی یہ ضروری قرار دیا گیا کہ اب وہ کم از کم ان بنیادی اور اصولی اخلاق کی پابندی لازماً اختیار کریں۔ اسلام لانے کے بعد مسلمان کہلانے کے بعد بھی اخلاق کا روز بروز بہتر نہ ہونا اگر مطلق ایمان کے فقدان کا نہیں تو کم از کم نبوت کے فیض سے محرومی کا نشان ضرور ہے۔ بقول اقبال:۔

آنکہ از صدق و امانت بے خبر روز تمہید رسالت بے خبر  
کار او گفتار بے کیفِ عمل او نیامِ علم بے سیفِ عمل

لَذَّتْ اَیْمَانٌ فَزَیْدٌ دَرِ عَمَلٍ مُرْدَةٌ اَآ اَیْمَانٌ کَہ نَایِدٌ دَرِ عَمَلٍ  
نُبُوْتِ سَے اَکْثَابِ فِیضِ کَا بَلَدِ تَرِیْنِ مَرْتَبَہِ مَکَارِمِ اَخْلَاقِ ہِیْنِ جَنْہِیْنِ مَقْصُوْدِ بَعْثِ نَبَوِیْ کَہَا گِیَا ہِے۔  
((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ مَکَارِمَ الْأَخْلَاقِ))<sup>(۱)</sup>  
”مِیں مَکَارِمِ اَخْلَاقِ کُو کَمَلِ کَرْنِے کَے لِیَے بَیْجَا گِیَا ہوں۔“

مَگر مُسْلِمَانِ ہوتے ہوئے بَیْجَا مَکَارِمِ اَخْلَاقِ کَے اَعْلَیٰ دَرَجَے تَکِ نہ پہنچ سَکنا فِیضِ نُبُوْتِ سَے یَکسر مَحْرُومِیٰ نہ سَہی  
”کَمِ نَصِیْبِی“ کِی عَلامَتِ ضَرُورِ ہِے۔ عَلامَہِ اِقْبَالِ نَے ”رُموْزِ بَے خُودِی“ مِیں گِدا گِر کَے واقِعَہِ مِیں اِپنَے باپ  
کِی نَصِیحتِ کَا ذِکْرِ کَر تَے ہوئے کَہا:

آ نَکَہِ مَہْتَابِ اَزِ سِرِّ اَنکَشْتِشِ دُوْنِیْمِ رَحْمَتِ اَوْ عَامِ دِ اَخْلَاقِشِ عَظِیْمِ  
اَزِ بَہَارِشِ رَیْگِ دِ بُو بَا یَدِ گِرْفَتِ بَہرَہِ اَزِ خُلُقِ اَوْ بَا یَدِ گِرْفَتِ

ایک حدیث میں آیا ہے کہ اگر تم اللہ کے ہاں اپنا درجہ و مرتبہ معلوم کرنا چاہو تو بس یہ دیکھ لو کہ تمہارے  
دل میں اللہ کا درجہ کیا ہے! اتنا ہی اس کے ہاں تمہارا درجہ ہے۔ اسی طرح اگر یہ دیکھنا ہو کہ محمد مصطفیٰ ﷺ  
کے ہاں ہمارا کیا درجہ ہے (کیونکہ مصطفیٰ سے بعد ہی تو بولہبی ہے) تو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ ہم نے اخلاقیات  
نبوی سے کتنا حصہ پایا ہے!



[حافظ صاحب مرحوم و مغفور کا یہ مضمون شیخ زائد اسلام سنٹر جامعہ پنجاب لاہور کی جانب سے شائع  
کردہ کتاب ”قرآن و سنت: چند مباحث“ سے لیا گیا ہے۔ احادیث کی تخریج قرآن اکیڈمی لاہور  
کے شعبہ مطبوعات نے کی ہے۔]

(۱) مجمع الزوائد للہیثمی ۱۸/۹۔ ومختصر المقاصد للزرقانی، ح ۱۸۴۔ السلسلة الاحادیث  
الصحيحة للالبانی، ح ۴۵۔ راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ۔ مسند احمد کی روایت میں ((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ صَالِحِ  
الْأَخْلَاقِ)) جبکہ موطا امام مالک میں ((..... حُسْنُ الْأَخْلَاقِ)) کے الفاظ ہیں۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت  
وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات  
درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔